باب4

علم (Knowledge)

علم سے کیا مراد ہے؟ کیا ہم کسی شے کا صحیح علم حاصل کر سکتے ہیں؟ کسی شے کی حقیقت کیا ہے اور کیا حقیقت کا علم ممکن ہے؟ علم کے مآخذ کون کون سے ہیں؟ ایسے ہی کئی ایک سوالات ہمارے ذہنوں میں ہمیشہ ابھرتے رہتے ہیں۔ ابتدائے زمانہ ہی سے مفکرین علم کی نوعیت اور ماہیت جاننے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ بعض مفکرین علم حاصل کرتے ہوئے کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن بعض فلسفی ہمیشہ اسی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ جاننے کی جستجو علم در علم کے پردے کھولتے چلی جاتی ہے۔ کیونکہ فکر کہیں رکتا نہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ فلسفہ میں کچھ بھی حتمی نہیں ہوتا۔ ہر نئے زمانے میں فکر کا ارتقا ہوتا رہتا ہے اور علم کے نئے نئے زاویے سامنے آتے رہتے ہیں۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ علم ہے کیا؟ علم ایک تجربہ ہے جو انسان کو ہر لحہ حاصل ہوتا رہتا ہے۔ ارسطو کا کہنا ہے کہ علم ایک ایسا تجربہ ہے جو حیرانی اور تعجب سے شروع ہوتا ہے۔ اور ہمیں ہر لحہ اس تجربہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تجربہ جب شعور و آگہی کی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ تو انسان اپنا اور اپنے دائرہ شعور میں آنے والے مسائل کا علم حاصل کرتا چلا جاتا ہے اور تصورات قائم ہوتے ہیں۔ بعض تصورات کی تصدیق کی جاسکتی ہے، بعض کی تصدیق ممکن نہیں۔ یونانی فلسفی سقراط کا خیال ہے کہ علم صحیح اعتقاد (Belief) کی تصدیق ہے۔

فلسفے کی شاخ علمیات کا اہم فریضہ علم کی وضاحت کرنا ہے۔ انسان کچھ بھی محسوس کرتے ہوئے اسے معنی دیتا ہے تو اس عمل کو ادراک کہتے ہیں اور ادراک جس کو محسوس کر رہے ہوتے ہیں اس کا علم ہوتا ہے۔ جتنا ہمارا ادراک زیادہ ہوگا۔ اتنا ہی ہمارا علم زیادہ ہوگا ہم اشیا مدرکہ کا شعور حاصل کرتے ہیں۔ تو ہمارے احاطۂ شعور سے ہوتا ہوا یہ علم لاشعور کی انتہائی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم علم کیسے حاصل کرتے ہیں؟ ہمارے ذرائع علم کیا ہیں؟ وہ کون کون سے وسائل ہیں جن کے ذریعے انسان جاننے کا عمل کرتا ہے۔

جان ہاسپر (John Hosper) اپنی تنقیدی کتاب ''فلسفیانہ تجزیہ کا تعارف'' (An Introduction to Philosophical Analysis) میں لکھتا ہے کہ علم کو قضیوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً میں جانتا ہوں کہ ''اب ایک کتاب پڑھ رہا ہوں۔'' میں جانتا ہوں کہ دو جمع دو چار ہوتے ہیں۔'' لیکن صحیح یا غلط قضیے کو جاننے کے لیے تصورات کا جاننا ضروری ہے۔ کیونکہ تصورات سے ہی جملے یا قضیے بنتے ہیں۔ مثلاً ''برف پگھلتی ہے'' اس میں برف اور پگھلنا دونوں کے معنی جاننے کے لیے ان کے تصورات کو جاننا ضروری ہے۔

بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ انسان کے ذہن میں پیدائشی طور پر وہبی خیالات (Innate Ideas) ہوتے ہیں۔ یعنی انسان پیدائشی طور پر خیالات لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ کیا ایسا ممکن ہے پیدائشی اندھا سرخ رنگ کا تصور لے کر پیدا

ہوتا ہے؟ کیا وہ سرخ رنگ کی شناخت کر سکتا ہے؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔

جان ہاسپر ایک اور مثال سے علم کی وضاحت کرتا ہے۔ علم کیا ہے؟ جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں مسٹر اے کو جانتا ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ مسٹر اے (Mr.A) سے میری مکمل شناسائی ہے۔ میں اس کے بارے میں پوری معلومات رکھتا ہوں۔ وہ میرا دوست ہے۔ میرا پڑوسی ہے وغیرہ وغیرہ۔

کوئی بھی قضیہ صحیح یا غلط اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک اس کی کسی نہ کسی طرح سے تصدیق نہ ہو جائے۔ بعض اوقات یقین کرنے سے بھی ہم کسی شے جملے یا قضیے کو صحیح تسلیم کر لیتے ہیں کیونکہ ہمارے علم کی وسعت اور حدود میں گہرائی نہیں ہوتی۔ ایک زمانے میں یہ کہا جاتا تھا کہ زمین چپٹی ہے تو لوگ اس بات کو مانتے تھے حالانکہ زمین چپٹی نہیں بلکہ گول ہے۔ لیکن علم کی حد سے ہم اس پر یقین کر لیتے ہیں۔

علم سے مراد حواس کے ذریعہ حاصل کردہ ادراک ہے۔ ادراک حاصل ہونے کے بعد۔ اس وقت تک صحیح لگتا ہے جب تک وہ غلط ثابت ہو کر نئی شکل نہ اختیار کر لے۔ گویا علم جاننے کا نام ہے۔

ماخذِ علم

Sources of Knowledge

علم کہاں سے حاصل ہوتا ہے؟ یعنی وہ کون سے وسیلے ہیں جن سے علم اخذ کیا جاتا ہے؟ انسان مختلف انداز اور طریق سے علم حاصل کرتا ہے۔ صحیح الذہن شخص سب سے پہلے اپنے حواس کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے۔ اس طرح متعدد ماخذ علم میں سے چند ایک یہ ہیں:

1- حسی ادراک یا حسی تجربہ (Sense Experience or Sense Perception)

2- عقل (Reason)

3- استناد (Authority)

4- وجدان (Intuition)

5- وحی والہام (Revelation)

یہ ماخذ علم بنیادی طور پر علم کے مکاتب فکر کا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔ مختلف فلسفیوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق جاننے کے عمل کو بیان کیا ہے۔

1- حِسّی تجربہ Sense Experience

حِس ایک سادہ تجربہ ہے۔ یہ ہمارا روزانہ کا معمول ہے۔ ذہن میں جب کوئی حِس بیدار ہوتی ہے تو اس کا کسی شے سے تعلق تلاش کیا جاتا ہے اور تجربات کی روشنی میں معنی کو گھٹایا بڑھایا جاتا ہے۔ حِسّی تجربہ میں توجہ، دلچسپی اور توقع سے مدد لی جاتی ہے۔ حِس کے ذریعے ہمیں خارجی اشیا کا علم حاصل ہوتا ہے اور جب ہمیں خود اپنی ذہنی حالت کا علم ہوتا ہے تو یہ داخلی ادراک کہلاتا ہے۔ اپنی خوشی، غمی، پریشانی

اور اطمینان کے بارے میں ہم خود ہی جانتے ہیں۔ یہی داخلی حسی ادراک ہوتا ہے۔

حِسّی تجربہ سے کسی شے کا صرف وقوف ہی حاصل نہیں ہوتا بلکہ ہم اس شے کو پہچان بھی لیتے ہیں۔ جاننے اور پہچاننے کے اس عمل کو ادراک کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ یاد اور فکر سے بھی ادراک حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ہم اشیا کو دیکھتے، آوازوں کو سنتے، ذائقے اور دباؤ کو محسوس کرتے اور بو یا خوشبو کو سونگھتے ہیں تو اسی طرح محسوسات کے ذریعے اشیا، آواز، ذائقہ، دباؤ اور بُو کا علم حاصل کرتے ہیں۔ بچہ کسی گول شے کو پہلی دفعہ دیکھ کر ایک چمکتی ہوئی شے ہی محسوس کرے گا۔ پھر اسے بتایا جائے گا کہ یہ چمکتی ہوئی شے روپے کا سِکہ ہے تو بچہ اس گول چمکتی ہوئی شے کو روپے کا ہی نام دے گا۔ اس سے اگلے مرحلے میں وہ اس چمکتی ہوئی گول شے یا روپے کو دیگر اشیا میں سے پہچان لے گا۔ اس سارے عمل کو حِسّی ادارک یا حِسّی تجربہ کہتے ہیں۔ حواسِ خمسہ سے حاصل کردہ علم کو بھی حِسّی ادراک یا حِسّی تجربہ کہا جاتا ہے۔ اس میں نقائص بھی پائے جاتے ہیں لیکن تجربہ سے ہم ان کو دور کر سکتے ہیں۔

وڈورتھ کے خیال میں ادراک کا کام ارض سے شکل تعمیر کرنا ہے۔ مثلاً مختلف اشیا میں سے بچے کا سکے کو پہچاننا، مختلف آوازوں میں سے اپنی ماں کی آواز پہچاننا اور پھر ماں کی آوازوں میں بھی غصہ اور پیار کی آواز میں تمیز کرنا وغیرہ۔

حِسّی تجربہ حِسّی تحسسات و مہیجات سے حاصل ہونے والا ایسا ذہنی عمل ہے جس سے ہم خارجی اور داخلی دنیا کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اشیا کو معنی پہناتے ہیں اور ارض سے شکل کو الگ کرتے ہیں۔

حِسّی تجربہ ایک ٹھوس (Concrete) اور مرکب (Complex) ذہنی عمل ہے جو کسی عضوِ حس کی تحریک اور اس کی تعبیر سے ظہور میں آتا ہے اور ہمیں خارجی دنیا سے واقفیت بہم پہنچاتا ہے۔ اس میں حواس اور ان سے متعلقہ تصورات اور خیالات بھی شامل ہوتے ہیں۔

حِسّی تجربہ یا حسی ادراک سے ہم گردوپیش کی دنیا کا تجربہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ پیدائش کے وقت بچے کے لئے کائنات ایک بے تفریق اور بے معنی تودہ سا لگتی ہے۔ وہ دنیا کی اشیا کے معنی نہیں سمجھتا۔ وہ ایک شے کو دوسری شے سے ممیز نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں اشیا کا ادراک نہیں رکھتا کیونکہ ادراک سے مراد اشیا کے معانی کو جاننا ہے۔ بچے کے لئے سانپ اور گڑیا میں کوئی فرق نہیں مگر آہستہ آہستہ وہ اشیاء کے معانی جاننے لگتا ہے۔ لہٰذا ادراک سے مراد اشیا کے معانی کو جاننا، اشیا میں امتیاز پیدا کرنے یا اشیا کا تجزیہ کرنے سے ہے۔ ٹچنر (Tichner) کے خیال میں حِسی تجربہ جتنا ترقی کرے گا اتنا ہی دنیا کو ہم بہتر طور پر سمجھیں گے۔ علم ادراک ہی سے حاصل ہوتا ہے اور حِسی تجربہ کے بغیر ہم بے علم رہتے ہیں۔ حِسّی تجربہ سے مراد مختلف اشیاء سے واقفیت ہے اور اشیا زمان ومکان میں پائی جاتی ہیں۔ اشیا سے حواس حاصل ہوتے ہیں اور ادراک حواس پر مشتمل ہوتا ہے۔ حِسّی تجربہ سب سے اہم اور پہلا ماخذِ علم ہے۔

2- عقل (Reason)

عقلی بنیادوں پر حسی ادراک کے بعد عقل اہم ماخذِ علم ہے۔ عقل میں فکر و تدبر سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ ارسطو کی منطق اور جدید منطق میں استدلال، استناج اور قیاس کے اصول وضوابط پر علمی موشگافیاں کی جاتی ہیں۔

عقل سے ذہنی مشق ہوتی ہے اور حافظے کی تربیت کی جا سکتی ہے۔ جب کوئی شخص کسی نئے ماحول اور حالات و واقعات میں اپنے

آپ کو پاتا ہے تو عقل ہی اسے ان مشکل حالات سے باہر نکالتے ہیں۔ استاد کو کوئی فکری نقطہ سلجھانا ہو، وکیل کو دلائل کی مدد سے اپنی بات کو موثر اور قابلِ فہم بنانا ہو یا جج کو حاصل کردہ دلائل، واقعات، بیانات اور شہادتوں کی بنا پر فیصلہ کرنا ہو تو پھر استدلال ہی سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

عقل کے استعمال سے تنقیدی سوچ پروان چڑھتی ہے۔ تنقیدی سوچ تحقیق وتفتیش میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان تمام مراحل کا دارومدار استدلال پر ہے۔ استدلال وہ طریق ہے جس سے کوئی بھی شخص اپنی علمی وفکری بساط کے مطابق کسی بھی نئی صورتِ حال سے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی علوم اب تک پروان چڑھے ہیں، سب عقل ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ دیئے ہوئے مقدمات میں سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی عقل کی اہم صورت ہے۔ ارسطو کی منطق میں ایک اہم مثال دی گئی ہے:

تمام انسان فانی ہیں۔

سقراط ایک انسان ہے۔

لہٰذا سقراط فانی ہے۔

اس منطقی استدلال میں پہلے دو مقدمات میں سے تیسرا نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ ان کو ترتیب دینا اور پھر نتیجے اخذ کرنا استدلال ہی ہے۔ اس طرح کہا جاتا ہے کہ تمام علوم کا دارومدار حسی ادراک کے بعد عقلی استدلال پر ہے۔

3-استناد (Authority)

ہم عموماً مشاہدہ اور تجربہ سے علم حاصل کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات براہ راست مشاہدہ اور تجربہ ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے دیگر ذرائع سے مدد لینا پڑتی ہے۔ یہ ذرائع، کتب، رسائل، ریڈیو، ٹی وی، اخبارات، قدیم سکے، آثار قدیمہ وشخصیات وغیرہ ہیں۔ ذاتی تجربہ ومشاہدہ کے علاوہ کسی بھی ذریعہ یا طریقہ سے حاصل کردہ شہادت، استنادیت کا درجہ رکھتی ہے۔

طلبہ وطالبات کے لیے اساتذہ، بچوں کے لیے والدین، مریدوں کے لیے پیر، مریض کے لیے ڈاکٹر عوام کے لیے سیاسی راہنما اور حکمران مستند شخصیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا کہا، علم میں اضافہ کرتا ہے اور سننے والا اس پر پختہ یقین رکھتا ہے۔

عقیدہ یا یقین (Faith or Belief) بھی استنادیت میں ذیلی ماخذ علم ہے۔ یعنی اگر کسی پر عقیدہ نہ ہو تو پھر معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ عقیدہ رکھنا اور عقیدے کا پختہ ہونا۔ انسان کو کسی مشاہدہ وتجربہ کا مکمل علم دینے میں مدد دیتا ہے۔

اس ماخذ علم میں چند ایک اہم نکات کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ واقعہ کے ہونے اور بیان کرنے کا درمیانی وقفہ جتنا کم ہوگا اتنی ہی شہادت یا بیان زیادہ صحیح ہوگا۔

شہادت، گواہی یا بیان دینے والے کا تجربہ اور کردار بھی جانچنا چاہیے۔ اور یہ بھی خیال کیا جائے کہ آلات کا استعمال ہوا ہے کہ نہیں۔ کیونکہ فی زمانہ سائنسی آلات کا استعمال کرنے سے وقت اور دولت کی بچت ہو جاتی ہے۔

ہم اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر تمام معلومات حاصل نہیں کر سکتے۔ علم کا حصول بھی ہر جگہ اور ماضی میں جا کر حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی لیے ہمیں کسی نہ کسی ہستی یعنی Authority کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ دوسروں پر اعتماد کرنا وقت کی ضرورت اور مجبوری ہوتا

ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح حاصل کردہ علم میں کہیں نہ کہیں نقائص ہوسکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود استنادیت ایک اہم ماخذ علم ہے۔ تاریخی واقعات، حادثات، علوم وفنون، ماضی میں گزرے ہوئے جملہ فلسفیوں کے فلسفیانہ افکار سب اسی مآخذ کے مرہون منت ہیں۔ ہم جس طرح ماضی میں جا کر علم حاصل نہیں کر سکتے اسی طرح دنیا کے مختلف مقامات لندن، جدہ، نیویارک، انقرہ، دہلی، کراچی، قاہرہ، تہران، بیجنگ وغیرہ کے بارے میں تمام علم حاصل نہیں کر سکتے۔ مختلف ہستیوں، ماہرین علم وفن کی تحریروں سے استفادہ کر کے علم حاصل کیا جاتا ہے۔

4- وجدان (Intuition)

عقلی تجربات سے گزر کر انسان ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں عقل وخرد ساتھ نہیں دیتے لیکن وہ مزید کچھ جاننے کی خواہش رکھتا ہے۔ چھٹی حس کی اصطلاح اسی مرحلے کے لیے استعمال کی جاتی ہے کہ انسان حواس خمسہ سے آگے جا کر بعض فیصلے کرتا ہے۔ فلسفی، مفکر، سائنس دان، شاعر اور ادیب وجدان ہی کی مدد سے فوری نتیجہ نکالتے ہیں۔

ہم روزمرہ زندگی میں اچھے یا بُرے کا انتخاب یا فیصلہ وجدانی کیفیت ہی میں کرتے ہیں۔ جج کسی مقدمہ کا صحیح فیصلہ وجدان سے ہی کرتا ہے۔ یہ ذریعہ علم انسان کو زندگی میں مختلف النوع حقیقتوں کو جاننے میں مدد دیتا ہے۔ سقراط کا کہنا تھا کہ مجھے ایک خاص قسم کی طاقت کنٹرول کرتی ہے۔ یہ یقیناً وجدانی کیفیت ہی ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں وجدان کی تعریف کرتے ہوئے یوں لکھا ہے کہ:

"It is a real, distinct and clear source of knowledge, it is personal and private experience. Intuitive experience cannot be conveyed to others."

"یہ ایک حقیقی منفرد اور واضح ذریعہ علم ہے۔ یہ شخصی اور ذاتی تجربہ ہے۔ وجدانی تجربہ دوسروں کو بتایا نہیں جاسکتا۔"

وجدانی تجربہ چونکہ ذاتی ہوتا ہے اس لیے کوئی دوسرا کسی کا تجربہ سمجھ یا جان نہیں سکتا اور یہ وجدانی تجربہ فوری ہوتا ہے۔ لیکن سب کو نہیں ہوسکتا۔ صوفی بے حد محنت و ریاضت سے اس مقام پر پہنچتا ہے۔ لیکن وہ بھی جو کچھ حاصل کرتا ہے اس طرح آگے بیان نہیں کرسکتا۔ صوفی وجدانی تجربہ میں انتہائی حد تک پہنچتا ہے اور پھر آگے نکل جاتا ہے۔ وجدانی تجربہ انسان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ اس کی حسی تجربہ کی طرح تصدیق نہیں ہوسکتی۔

5- وحی والہام Revelation

مذہبی نقطۂ نظر سے وحی یا الہام کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندے یعنی رسول کی معرفت الہامی علم دیگر انسانوں کو پہنچاتا ہے۔ وحی یا الہام میں تین نکات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں:

1- وحی یا الہام کے ذریعے ظاہری حواس سے مخفی اشیا سے متعلق علم حاصل ہوتا ہے۔

2- یہ وہ طریق یا ذریعہ علم ہے جو حواس اور منطقی و عقلی استدلال سے ماورا ہے۔

3- الہامی علوم کا انسانی زندگی کے ہر پہلو سے تعلق ہوتا ہے تا کہ وہ عملی نظامِ حیات کی بنیاد بن سکیں۔

وحی یا الہام نوعیت کے لحاظ سے اعلیٰ و برتر آخذ علم ہے، جس کے اہل صرف اور صرف نبی ہی ہوتے ہیں۔

الہام یا وحی ایک ایسا ماخذ علم ہے جو اہم ترین اور اعلیٰ و مقتدر ہستیوں کے لیے ہوتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ الہام کی منزلوں تک صرف خاص الخاص شخص ہی پہنچتا ہے۔ جسے مذہبی زبان میں نبی کہا جاتا ہے۔ اس تجربہ کے کئی ایک درجے ہیں۔ علامہ محمد اقبالؒ نے وجدان اور الہام کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان میں نوعیت کا نہیں بلکہ درجے کا فرق ہے۔ وجدانی کیفیتوں کے انتہائی درجوں کو چھونے کے بعد الہامی کیفیت ہوتی ہے۔ صوفی، ولی، مفکر، فلسفی، وجدان کی انتہائی کیفیتوں تک پہنچ کر آگے نکل جاتے ہیں لیکن الہام کی انتہائی کیفیتوں تک صرف نبی ہی پہنچتا ہے۔ وہ عقل فعال (Active Intellect) کی مدد سے پیغامات وصول کرتا ہے۔ اس میں باطنی اور ذاتی تجربہ ہوتا ہے۔ ماخذ علم میں اس کا انتہائی درجہ ہے جس میں بے شمار انسانی قوتیں کام کرتی ہیں۔ یہ تجربہ بھی جیسے محسوس ہوتا ہے اسی طرح بیان نہیں کیا جاسکتا۔ صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ آگے پیغام لوگوں کی سمجھ بوجھ والی زبان میں دیا جاتا ہے۔ یعنی آگے کلام کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔ اسے کیسا تجربہ ہوا۔ کس سے کس طرح کا رابطہ ہوا بیان سے ماورا ہے۔

الہامی کیفیتیں کسی دوسرے کی سمجھ بوجھ کے لیے قطعی مشکل بلکہ ناممکن ہوتی ہیں اس لیے ہر عالم اپنی سوچ و بچار اور عقل کے مطابق تاویلیں کرتا ہے۔ اس میں تاویلیں کرتے ہوئے مختلف علماء کی اپنی اس علمی و فکری بساط کے مطابق اُن کے نقطہ نظر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے مذہبی بحثیں جنم لیتی ہیں۔

بہت سارے حسّی تجربات مل کر ایک استدلال بناتے ہیں اور استدلال عقل سے ممکن ہے۔ بہت سارے عقلی تجربے اور استدلال مل کر ایک وجدانی تجربہ پیدا کرتے ہیں۔ اور متعدد وجدانی تجربات و کیفیتیں مل کر الہامی کیفیت کی ابتدا کرتی ہیں۔

کوئی بھی وجدان کبھی بھی عقلی استدلال اور حسّی تجربہ کے بغیر ممکن نہیں۔ یعنی ہر تجربہ مرحلہ وار ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ حسّی تجربہ نہ ہوا ہو تو وجدانی تجربہ ہو جائے۔ جس درجے کا جو شخص ہوگا اسے ویسا ہی تجربہ ہوگا۔ ہر شخص کی جسمانی اور دماغی ساخت، کیمسٹری اور صحت ذہنی کے مطابق تجربہ ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کا علم ادنیٰ و کمتر درجہ والوں کو سمجھ نہیں آسکتا۔

نظریاتِ علم (Theories of Knowledge)

علم کے مختلف نظریات ہر دور میں پروان چڑھتے رہے ہیں۔ فکری و عقلی مدارج کے مطابق متعدد نظریاتِ علم قائم کیے جا چکے ہیں جن میں سے دو سب سے اہم ہیں۔ جدید فلسفیوں نے علم کی بنیاد عموی طور پر انہیں پر رکھی ہے۔ یہ نظریاتِ علم عقلیت اور تجربیت ہیں۔

1- عقلیت Rationalism

عقلیت سے مراد استدلال کے ذریعہ سے علم حاصل کرنا ہے۔ مختلف مکتبہ فکر کے فلسفیوں نے ہمیشہ فلسفیانہ افکار کی بنیاد عقل و خرد پر رکھی۔ یونانی فلسفی افلاطون (Plato) اور ارسطو (Aristotle) عقلیت کے بڑے علمبردار ہیں۔ کانٹ (Kant) کے تنقیدی فلسفے میں بھی عقلی دلائل کی انتہا ملتی ہے۔ جدید فلسفے کا بانی ڈیکارٹ (Descartes) اور اسی طرح اسپائی نوزا (Spinoza)،

لائبنیز (Leibnitze) اور ہیگل (Hegel) نے بھی عقلیت کے سہارے اپنے فلسفیانہ افکار بیان کئے۔

جدید ماہرین ریاضی، الجبرا اور سائنس دانوں کے پیش کردہ افکار ونظریات عقل واستدلال پر مبنی ہوتے ہیں۔ عقل ایک اہم ماخذ جس کے ذریعے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔

فلسفہ کے عقلی پہلو سے مراد سائنسی نقطہ نظر سے کسی شے، نظریہ یا عقل کا تجزیہ کرتے ہوئے نظریات یا مفروضے قائم کرنا ہے۔ عقلیت پسندی انسان کو بلاوجہ اندھے اعتقاد، توہم پرستی، تنگ نظری اور جہالت سے بچاتی ہے۔ عقلیت پسندوں نے انسان کو ذہنی الجھاؤ اور گھٹن کے ماحول سے نکال کر آزادانہ ماحول میں سوچ بچار اور فکر وتدبر کی راہ پر ڈال دیا۔

عقلیت سے حالات وواقعات کا جائزہ لینے کے علاوہ نئ علمی، ادبی اور فکری اختراعات کرتے ہیں۔ انسانی ذہنی قابلیت کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ جن کی بنا پر وہ زندگی کے مسائل حل کرتے ہیں۔ جہاں غور وفکر اور سوچ بچار سے کام لیا جائے وہاں عقل کا استعمال ضرور ہوتا ہے۔ عقلیت پسندوں کے نزدیک ذہنی قابلیتیں پیدائشی ہوتی ہیں لیکن مشق اور عمل سے ان میں نکھار پیدا کیا جاسکتا ہے۔ بعض ذہین لوگ مسائل کا حل جلد تلاش کر لیتے ہیں اور بعض غیر معمولی کوشش وتردد سے حقیقت تک پہنچتے ہیں۔ عقل کو سوجھ بوجھ کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ استدلال عقل کے استعمال سے ممکن ہے۔ ہر بامقصد فکر کی انتہا منطقی استدلال پر مبنی ہوتی ہے۔ کیونکہ حقائق پر مبنی صحیح نتیجہ استدلال ہی سے ممکن ہے۔ استدلال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک استخراجیہ اور دوسرا استقرائیہ۔

مثلاً:

تمام انسان فانی ہیں۔

اسلم ایک انسان ہے۔

لہٰذا اسلم فانی ہے۔

''تمام انسان فانی ہیں'' مقدمہ کبریٰ ہے اور ''اسلم ایک انسان ہے'' مقدمہ صغریٰ ہے۔ ان سے نتیجہ ''اسلم فانی ہے'' نکالا گیا ہے۔ مقدمہ کبریٰ کلیہ موجبہ ہے اور نتیجہ جزئیہ موجبہ ہے۔ اسی طرح استخراجیہ استدلال میں کل سے جز کی طرف جایا جاتا ہے۔ یعنی کلیہ موجبہ میں انسان کی کل جماعت کا ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ اسلم اس کل کا ایک جز ہے۔ نتیجہ میں انسان بڑی جماعت کے ایک جز اسلم کا ذکر کیا گیا ہے۔

اسی طرح استدلال استقرائیہ میں ہم جزئیات کو سامنے رکھ کر ''کل'' کا نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

استقرائیہ میں چند ایک جزئیات کو سامنے رکھ کر استقرائی زقند لگائی جاتی ہے۔ استقرائیہ کی بہت اہمیت ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر استخراجی عمل ممکن نہیں۔ اس میں حقائق کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ جزئیات کو جمع کرنا بھی ایک اہم سائنسی طریقہ کار ہے۔ استدلال استقرائیہ اجزا سے کل کا نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ مثلاً

اسلم فانی ہے، زید فانی ہے، عمر فانی ہے۔

لہٰذا تمام انسان فانی ہیں۔

استقرائی استدلال میں حاصل کردہ مقدمات محض جزوی جواز مہیا کرتے ہیں۔ عقلیت ہی کی مدد سے طبیعی علوم میں اسی قسم کا استقرائی استدلال کیا جاتا ہے۔ جزئی حقائق کے مشاہدے سے نتائج حاصل کئے جاتے ہیں۔ چند ایک واقعات کو دیکھ کر کل کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے۔ اس طریق کار کو سائنسی طریقہ کہا جاتا ہے۔ اسی لیے سائنس میں عقل کا عمل دخل بے حد ہے یعنی سائنس میں کوئی بھی مفروضہ عقلی استدلال کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا۔

عقلیت میں استخراجی اور استقرائی دونوں طریقہ ہائے استدلال کے ذریعے علم حاصل کیا جاتا ہے۔ علم کے حصول میں عقلی موشگافیوں اور فکری انگیختوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔

کوپرنیکس، کپلر اور گلیلیو نے بھی عقلیت کی بنا پر اس بات کو یقینی جانا کہ ریاضی سے کائنات کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ان فلسفیوں کے افکار میں پائی جانے والی عقلیت پسندی کی فلسفیانہ تشکیل جدید فلسفی ڈیکارٹ کے افکار میں واضح ملتی ہے اس نے سوچ و بچار سے علم کی بنیاد رکھی۔ ڈیکارٹ کا مشہور عقلی مقولہ ''میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں'' "I think therefore I am" عقلی استدلال کی سب سے بڑی مثال ہے۔

2- تجربیت (Empiricism)

تجربیت بھی حصول علم میں اہم مکتبہ فکر ہے۔ اس سے مراد علم صرف اور صرف حسی تجربات سے ممکن ہے۔ حسّی ادراک تمام علوم کی بنیاد ہے۔ یعنی سب سے پہلے حسی تجربہ ہوتا ہے اور اس کے بعد عقلی جواز مہیا کیا جاتا ہے۔

حس ایک سادہ تجربہ ہے۔ جو ہمارا روزانہ کا معمول ہے۔ یہ ایک وقوفی عمل ہے۔ ہم آلات حس کے ذریعے کسی بھی مادی شے کے مختلف پہلوؤں سے متعلق سادہ ترین تجربات حاصل کرتے ہیں۔ حسی تجربہ میں علم کسی مدرکہ شے کے معنی حاصل کر کے وقوف کا درجہ پاتے ہیں۔ یہ بالکل ابتدائی مرحلہ ہے جس میں کوئی بچہ پہلی دفعہ ابتدائی علم حاصل کرتا ہے پہلی دفعہ کسی شے کو دیکھ کر اس کو کوئی معنی دیتے ہوئے اس کے بارے میں جانا جاتا ہے۔ کسی کھلونے، پھل، یا ٹافی وغیرہ کو پہلی دفعہ جب بچہ دیکھتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل، جسم، چمک، رنگ اور دیگر خاصیتوں کا ملا جلا بالکل بنیادی سا علم حاصل کرتا ہے۔ پھر کسی کے بتانے پر اس کا نام لیتا ہے۔ اس کا نام لینے یا کہنے کو ہی اسے معنی دینا کہا جاتا ہے۔

انسان حواس خمسہ کی مدد سے حسّی تجربہ حاصل کرتے ہیں دراصل یہ پانچ بیرونی حواس ہیں یعنی دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا اور چھونا۔ ان کے علاوہ اندرونی حواس بھی ہیں یعنی بھوک، پیاس، دکھ، نفرت، محبت اور درد وغیرہ۔ جان لاک کے خیال میں اندرونی حواس تین ہیں: احساس کرنا(Feeling)، خواہش کرنا(Desiring) اور ارادہ کرنا(Willing)۔ آلاتِ حس اندرونی بھی ہوتے ہیں اور بیرونی بھی، بیرونی آلاتِ حس ناک، کان، زبان، آنکھ اور جلد ہیں۔ جبکہ اندرونی آلات حس، دل، جگر، معدہ اور آنتیں وغیرہ ہیں۔

جلد کے بیرونی حصے ایک خول کا کام دیتے ہیں۔ بیرونی حصے حساس نہیں ہوتے۔ ہم تمام حسّی تجربے نظام عصبی کی بدولت حاصل کرتے ہیں۔ اگر کہیں اعصاب میں نقص یا رکاوٹ ہو تو ہمیں متعلقہ حسّی تجربہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ گویا نظام عصبی ہی اس ابتدائی علم کو حاصل کرنے کا اصل ذریعہ ہے۔ آنکھ، آلہ حس ہے۔ آنکھ بصری عصب کو اطلاع پہنچاتی ہے۔ آنکھ کے پردے پر شکل بنتی ہے اور دماغ

دیکھنے میں مدد دیتا ہے یا کنٹرول کرتا ہے۔ اسی طرح کان آلہ حس ہے۔ کان کے اندرونی حصے میں طبل گوش ہے اور کان کی نالی ہے۔ ہوا میں ارتعاش پیدا ہو کر سمعی نالی کے ذریعے ارتعاش ہتھوڑے نما ہڈی پر سنائی دیتی ہے اور یہ سمعی حس بھی دماغ کی مدد ہی سے سنائی دیتی ہے۔

حس کی ماہیت یہ ہے کہ ہر حس شعور کی ابتدائی شکل ہے۔ جو ہر عضو میں موجود ہے۔ حس ایک وقوفی عمل بھی ہے جو خارجی دنیا اور داخلی عضویاتی کیفیات کا علم دیتی ہے۔ حس اس وقت وجود میں آتی ہے۔ جب بیرونی یا اندرونی مہیج سے کوئی آلۂ حس متاثر ہوتا ہے۔ حس ہمیشہ دماغ میں پیدا ہوتی ہے۔ اور حس ہی کے ذریعے دماغ پہلی مرتبہ خارجی دنیا سے آشنا ہوتا ہے۔ حس ایک مجرد (Abstract) ذہنی عمل ہے کسی خالص حس کا کوئی وجود نہیں۔ یہ ہمیشہ کسی شے یا کسی کیفیت سے متعلق ہوتی ہے۔ ہر حس کے لیے ایک خاص آلہ حس ہوتا ہے۔ چونکہ حسّی تجربہ ہم دماغ ہی سے حاصل کرتے ہیں اس لیے ہر حس دماغ کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

کیفیت، شدت وسعت، زمانیت اور مقامی نشانات حس کی کیفیات ہیں۔ بامعنی حس کو ادراک کہتے ہیں۔ ادراک (Perception) کے معنی علم حاصل کرنا ہے۔ جتنا ہمارا ادراک وسیع ہوگا اتنا ہی علم میں اضافہ ہوگا۔ ادراک کے مختلف مدارج ہیں۔ جن سے گزر کر ہمیں مکمل ادراک حاصل ہوتا ہے۔ یہ مکمل ادراک تجربہ پر مبنی ہوتا ہے۔ ادراک کا پہلا درجہ خالص ادراک ہے دوسرا مخلوط ادراک اور تیسرا علامتی ادراک ہے۔

غلط ادراک کو التباس (Illusion) کہتے ہیں۔ ارسطو نے ایک مثال بیان کی تھی کہ دور سے ایک چیز آتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایسے لگتی ہے جیسے کوئی گائے ہو۔ تھوڑی سی قریب آئے تو ایسا لگتا ہے کہ گائے نہیں کوئی اجنبی شخص ہے اور قریب آئے تو کوئی شناسا شخص معلوم ہوتا ہے۔ جب بالکل قریب آجائے تو وہ اپنا دوست ہوتا ہے۔ اب اگر اس مثال پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ گائے نظر آنے سے لے کر اپنا دوست نظر آنے تک وہ شخص تو وہی ہے جو دور سے ہماری طرف آرہا ہے۔ جب اسے پہچان لیا کہ فلاں دوست ہے تو اس کا مکمل ادراک حاصل ہوا اور جسے گائے اور اجنبی شخص نظر آتا ہے، غلط ادراک یا ہمارا التباس ہے؛ اسی طرح بعض اوقات ہمیں کسی شے کے غیر موجود ہونے کے باوجود کچھ دکھائی دینا ادراک نہیں بلکہ ہمارا وہم (Hallucination) ہے۔

اگر کوئی شے موجود ہو اور صحیح حس پیدا ہو تو صحیح اور مکمل ادراک حاصل ہوتا ہے اور اگر کوئی شے موجود ہو، اور غلط حس پیدا ہو تو التباس یا غلط ادراک حاصل ہوتا ہے اور اگر کوئی شے موجود ہی نہ ہو اور کوئی حس پیدا ہو تو یہ نہ تو ادراک ہے اور نہ التباس بلکہ یہ وہم ہے۔ جیسے نشہ کرنے والوں کو ایک شے کی بجائے دو دو نظر آتی ہیں۔ یا بغیر کسی آواز کے آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

اس بات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حسّی تجربہ میں کئی ایک نقائص ہیں۔ اگر کسی شخص کو حسّی تجربہ نہ ہو تو وہ کسی قسم کا کوئی تصور پیدا نہیں کرسکتا۔ مثلاً اگر کوئی شے دیکھی نہ ہو تو جاگتے یا سوتے اس کا کسی طور تصور ذہن میں پیدا نہیں ہوسکتا۔

عقلی استدلال اور تجربیت کا ہمیشہ سے ہی آپس میں فکری مناقشہ رہا ہے۔ تجربیت پسند وہبی خیالات (Innate Ideas) کو صحیح نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ ہی کی وجہ سے انسان صحیح علم حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یونانی فلسفہ میں سوفسطائی تجربیت کے قائل تھے۔ جبکہ فلسفہ جدید میں بیکن (Bacon) ہابز (Hobbes)، جان لاک (John Locke) برکلے (Berkeley)

اور ہیوم (Hume) کے نظریات تجربیت کے مکتبہ فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔

برکلے (Berkeley) کے خیال میں خارجی اشیا کے علم کا انحصار خود ہمارے داخلی تفکر اور ذہنی سوچ پر مبنی ہے۔ ہم اشیا کا علم حاصل نہیں کرتے بلکہ محض ان کی حسی صفات کا ادراک حاصل کرتے ہیں۔ برکلے (Berkeley) حسّی صفات، ادراک اور ذہن کی اصلیت وحقیقت کو تسلیم کرتا ہے لیکن اشیا کے مستقل وجود کو نہیں مانتا۔ ہیوم (Hume) نے اس نقطۂ نظر کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا ہے کہ جس طرح خارجی اشیا کے مستقل وجود کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے بلکہ محض حسی صفات ہی وجہ سے ان کے ہونے کو مانتے ہیں۔ اسی طرح ذہن کی مستقل حیثیت معلوم نہیں بلکہ صرف ذہنی اعمال کی وجہ سے ہی ذہن کو مانتے ہیں۔ ہیوم (Hume) نے تجربیت کو فلسفیانہ انداز میں اس طرح بیان کیا کہ وہ تشکیک کا شکار ہو گیا۔

جدید فلسفی لاک کا خیال ہے کہ حواس ہمیں خارجی علم مہیا کرتے ہیں جبکہ تفکر ہمیں داخلی کیفیاتِ ذہنی کا پتہ دیتا ہے۔ برکلے کا خیال ہے کہ خارجی اشیا کے علم کا انحصار خود ہمارے داخلی تفکر اور ذہن پر ہے۔ بلکہ کسی شے کا موجود ہونا بھی ادراک ہی سے ممکن ہے۔ برکلے کے خیال میں اشیا کا علم حاصل کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہم محض اشیا کی حسی صفات کا ادراک حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح ڈیوڈ ہیوم کا کہنا ہے کہ جو شے ہمارے تجربے میں آتی ہے۔ وہ حسّی صفات اور ان سے پیدا ہونے والے حسّی تجربات ہی ہیں۔

تجربیت کے ماننے والوں کا نقطہ نظر واضح ہے کہ جس شے کا ہمیں تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعے علم حاصل نہ ہوا ہو ہم اس کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتے۔ بلکہ خواب بھی کسی ایسی شے کا نہیں دیکھ سکتے جس کا پہلے تجربہ نہ ہوا ہو۔ پیدائشی اندھے کو سرخ یا کسی بھی رنگ کا تصور ذہن میں نہیں آ سکتا۔ اس نے کبھی رنگ دیکھا ہی نہیں وہ اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح پیدائشی بہرہ آواز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ اسے اس کا تجربہ ہی نہیں ہوا۔ لہٰذا تجربہ کی بنا پر علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حسّی ادراک میں نقائص پائے جاتے ہیں۔ جیسے التباس اور واہم وغیرہ۔

امام الغزالیؒ کا تصورِ علم (Imam AlGhzali's Concept of Knowledge)

مسلم فلسفی حجۃ الاسلام ابو حامد الغزالیؒ نے اپنی کتاب "احیا العلوم الدین" کی جلد اوّل میں فلسفہ علم تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سیکھنے کے عمل سے گزرتے ہوئے علوم کی ترتیب کا خیال رکھا جائے اور بتدریج علوم سکھائے جائیں۔ علم ہی کو فضیلت حاصل ہے۔ انسان جانوروں سے علم ہی کی وجہ سے منفرد ہے اور انسان اسی وقت اشرف المخلوقات کہلائے گا جب اس میں شرف یعنی علم موجود ہوگا۔ انسان کی شرافت صرف علم کی رو سے ہے اور اسی علم کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔

علم کے درجے

امام الغزالیؒ کے نقطہ نظر کے مطابق علم کو چار بڑے درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

درجہ اوّل: انبیاء کا منصب اور کام سب سے ارفع اور اعلیٰ ہے کیونکہ وہ بغیر کسی اختصاص کے اللہ کے احکام لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عالم انبیاء کے وارث ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی رتبہ نبوت سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اس لئے

امام الغزالیؒ کے خیال میں علم کا سب سے اعلیٰ درجہ انبیا کا علم ہے۔ وہی اس کو جان اور سمجھ سکتے ہیں کیونکہ انسانوں میں ان کا درجہ سب سے برتر ہے۔ یقیناً برتر کا علم بھی اعلیٰ کیفیت کا ہوگا کیونکہ انبیاء باطن کا تزکیہ بھی فرماتے ہیں۔

درجہ دوم: خلفاء وملوک کا کام معاشرے کی بہتر تعلیم وتربیت کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے اختیارات اور قانون کی رو سے معاشرہ کی تربیت کا اہتمام کرتے ہیں۔ ظلم کو قوت سے روکتے ہیں۔ انبیاء کرام کے بعد کا درجہ خلفاء وملوک کا ہے۔ اس لئے وہ اس درجہ کے علم کے حامل ہوتے ہیں۔

درجہ سوم: علمائے ربانی اپنے انداز سے علمی وفکری نکات کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس درجہ کا علم رکھنے والے علما سے صرف خواص ہی استفادہ کرتے ہیں۔ وہ عوام کی بجائے چند اعلیٰ نفوس کی اصلاح کرتے ہیں جو معاشرتی فلاح و بہبود کا کام کرتے ہیں۔

درجہ چہارم: امام الغزالیؒ کے بتائے ہوئے علم کے چوتھے درجے میں واعظین آتے ہیں۔ واعظ کا کام فکر ونظر سے علم کی وضاحت کرنا ہوتا ہے۔ منطقی طریق کار سے اپنی تقاریر سے علم کے فوائد کی عملی صورت پیدا کرنا ہوتی ہے۔ عوام کی دینی ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کی باطنی وظاہری تربیت کی جاتی ہے۔ واعظ میں عوام الناس کی معاشرتی واخلاقی حالت بہتر بنانے میں مدد دی جاتی ہے۔

امام الغزالیؒ کے نزدیک علم کی اہمیت وافادیت یہ ہے کہ انسان ولایت وکشف کی سطح تک پہنچ جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو پالیتا ہے۔ علم کی حقیقت ہی انکشاف ہے اور اس انکشاف سے مراد اللہ تعالیٰ کے بارے میں جاننا ہے۔ امام الغزالیؒ صوفی تھے۔ تصوف میں علم کی بے حد اہمیت ہے، جو یقین کے مراحل طے کرنے سے پورا ہوتا ہے۔ یقین کا درجہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس کے تین درجے ہیں:

۱۔ علم الیقین: اس درجے میں دنیاوی معاملات کو ان کے احکام کے ساتھ جانا جاتا ہے۔ علم الیقین عالموں کا درجہ ہے۔

۲۔ عین الیقین: جس کا مطلب حالتِ نزع اور وقتِ رحلت کا علم ہے۔ عین الیقین عارفوں کا درجہ ہے۔

۳۔ حق الیقین: اس درجے میں جنت میں خدا کے نمودار ہونے اور اس کے احوال اور کیفیت کو جاننا ہے۔ حق الیقین محبانِ حق کی فنا کا درجہ ہے۔

علم الیقین مجاہدہ سے حاصل ہوتا ہے، عین الیقین محبتِ الٰہی سے اور حق الیقین مشاہدۂ حق سے۔

عظیم مسلم فلسفی امام الغزالیؒ کے خیال میں تصوف علم وعمل کا امتزاج ہے۔ یعنی تصوف میں عمل کے ذریعے علم حاصل ہوتا ہے۔ اشیا کا علم ہمیں حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ محسوسات، معقولات اور روایات کی بنیاد پر علم میں اضافہ ہوتا ہے لیکن بعض اوقات غور وفکر کے بغیر اچانک ہمیں کسی شے کا ادراک ہو جاتا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں اسے وجدان یا کشف کہا جاتا ہے۔ یہ کشف دل کی ایک مخصوص کیفیت ہے جو مجاہدے اور تزکیہ نفس کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔

امام الغزالیؒ کا خیال ہے کہ جو شخص خود علم حاصل کرتا ہے، اُسے چاہیے کہ وہ اس علم کی ترسیل کرے اور دوسروں کو بھی سکھائے۔ ایسا کرنے کے لئے حکمت ودانائی کی ضرورت ہے۔ جو کوئی شخص لوگوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتا ہے، اس کی بخشش وکامیابی کے لیے اللہ خود مدد کرتا ہے۔ غزالی کے نقطۂ نظر کے مطابق علم روح کی غذا ہے۔ علم کی فضیلت اضافی نہیں بلکہ حقیقی اور اصلی ہے۔ جس شخص کے دل

میں علم کی طلب موجود نہیں وہ سمجھ لے کہ وہ بیمار ہے۔

امام الغزالیؒ کے افکار کو مدنظر رکھیں تو علم کے اہم مقاصد یہ بنتے ہیں کہ علم سے آخرت کی معرفت کا حصول ممکن ہے۔ فکرِ آخرت کی نشو و نما بھی علم ہی کے باعث ہوتی ہے۔ علم معرفتِ الٰہی، رضائے خداوندی، انسانی اعلیٰ کردار کی تشکیل اور انسانی شخصیت کے ظاہر و باطن میں توازن قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

علم کی اقسام: امام الغزالیؒ نے عمومی طور پر علم کو دو بڑی اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ وہ اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف ''احیاء العلوم'' کی جلد اوّل میں علوم کی تقسیم اور فضیلت کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں پہلی قسم علم محمود اور دوسری علم مذموم ہے۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق علم ہمیشہ بامقصد ہوتا ہے۔ دراصل علم کی اس تقسیم سے مراد علم کا استعمال ہے۔ اگر علم کو علم برائے زندگی، برائے ترقی انسان، فلاحِ عامہ اور رضائے الٰہی کے لیے استعمال کیا جائے تو یقیناً یہ علم محمود ہے اور اگر علم کو انسانیت کی تذلیل اور خدا سے دوری کے لیے استعمال کیا جائے تو اسے علم مذموم کہا جائے گا۔ علم محمود کو مزید دو اقسام فرضِ عین اور فرضِ کفایہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسلام کے بنیادی ارکان اور عقائد سے فرضِ عین اور انسانی مرضی کے عمل دخل سے حاصل کردہ علوم تفسیر، حدیث، فقہ، علم الکلام، طِب، ریاضی، صنعت و حرفت، زراعت، پارچہ بافی، کاشتکاری وغیرہ فرضِ کفایہ ہیں۔

آدابِ علم: امام الغزالیؒ کے تصورِ علم کی اہمیت اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انہوں نے طالب علم کے لئے علم حاصل کرنے کے آداب بیان کیے ہیں۔ وہ اپنی تصنیف احیاء العلوم کے حصہ اوّل کے پانچویں باب میں طالب علم کے لیے دس آداب کا ذکر کرتے ہیں جن کو اپنا کر وہ مثالی طالب علم بن سکتا ہے۔ انہوں نے یہ دس آداب یوں درج کیے ہیں:

1- طالب علم اپنے نفس کو رذیل عادات اور بری صفات سے پاک کرے۔ اس لیے کہ علم دل کی عبادت اور باطن کی درستی اور اس کا نزدیک ہونا خدا تعالیٰ سے ہے۔

2- طالب علم دنیا کے شغل کے علاقے کم کردے یعنی زیادہ مسائل میں گھرنے سے اجتناب کرے۔

3- علم پر تکبر نہ کرے اور استاد سے عزت و احترام سے پیش آئے۔ استاد کی نصیحت کو اس طرح مانے جیسے کوئی جاہل بیمار اپنے طبیب مشفق کی مانتا ہے۔

4- طالب علم ابتدا میں لوگوں سے اختلاف سننے سے احتراز کرے خواہ وہ دنیاوی علم حاصل کرنا چاہتا ہو، خواہ آخرت کا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اختلاف سننے والے کی عقل متحیر، ذہن پریشان اور رائے سست ہو جاتی ہے نیز ادراک اور اطلاع سے ناامیدی گھر کرتی ہے۔

5- طالب علم عمدہ علوم میں سے کوئی فن سیکھے اور اس میں کمال پیدا کرے جبکہ دیگر علوم سے بھی تھوڑی تھوڑی واقفیت حاصل کرے۔

6- علم کے فنون سے کسی فن کو دفعتاً اختیار نہ کرے بلکہ ترتیب کے لحاظ سے جو اہم ہو، اسے شروع کرے۔

7- کسی فن میں اس وقت تک قدم نہ رکھے جب تک کہ اس سے پیشتر کے فن کو پورا نہ کرلے۔ علوم میں ترتیب اور مرحلہ وار آگے بڑھنا چاہیے۔

8- طالب علم اس سبب کو معلوم کرے جس سے علوم کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

9- طالب علم اپنے باطن کو آراستہ اور فضیلت سے مزین کرے تا کہ خدا کا قرب حاصل کر سکے۔

10- اصلی مقصود معلوم کرے تا کہ مرحلہ وار منزل حاصل کی جا سکے۔

عظیم مسلم مفکر و صوفی امام الغزالیؒ کا خیال ہے کہ جس طرح جسم کو چند روز خوراک نہ ملے تو اس کی موت واقع ہو سکتی ہے، بالکل اسی طرح قلبِ انسانی کو اگر چند روز علم کی غذا نہ ملے تو اس کی بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ جس شخص کے دل میں علم کی خواہش موجود نہیں، وہ سمجھ لے کہ وہ بیمار ہے۔

امام الغزالیؒ کا نقطۂ نظر ہے کہ جو شخص خود علم حاصل کرتا ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ یہ علم دوسرے تک پہنچائے۔ امام الغزالیؒ علم کو انسان کے مختلف مسائل کے حل کا وسیلہ تصور کرتے ہیں۔ علم سے زندگی کے اسرار و رموز کا پتہ چلتا ہے۔ علم سے حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ خدا کو علم ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ فکر کی بلند ترین صورت خدا کی ذات وصفات کے بارے میں غور وفکر ہے جس سے خدا سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ خدا سے مکمل محبت عرفانِ ذاتِ باری سے ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص انکشاف کی اس سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ خدا کا علم حاصل کرتا ہے۔

امام الغزالیؒ کے تصورِ علم کے مطابق انسان کو اپنی ذات کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ خدا شناسی ہوتی ہے۔ آخرت کی معرفت کا حصول اور فکرِ آخرت کی نشو ونما بھی ہوتی ہے۔ جہاں خدا شناسی کے لیے تگ و دو کی جاتی ہے وہاں صرف علم ہی معرفتِ الٰہی کے حصول کو آسان بناتا ہے۔ جہالت کی بجائے علم کی روشنی انسان کو رضائے خداوندی کے ساتھ ساتھ انسانی شخصیت کے ظاہری و باطنی رموز سے بھی واقف کرتی ہے۔ مثالی کردار کی تشکیل نفس کو برائیوں سے پاک کر کے کی جاتی ہے، یہ صرف علم ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ استاد اور شاگرد کا مقدس رشتہ بھی اسی لیے زیادہ اہم ہے کہ تعلیم کے عمل میں استاد اہم کردار ادا کرتا ہے۔ استاد پیغمبرانہ میراث کا حامل ہوتا ہے۔ طالب علم کی علمی اور فکری رہنمائی استاد ہی سے ممکن ہوتی ہے۔ اس لیے علم کا حاصل کرنا اسلامی تعلیمات کے مطابق تعلیم حاصل کرنا یقیناً اعلیٰ کردار کی نشو ونما کے لیے ضروری ہے۔

مشقی سوالات

انشائی طرز (Subjective Type)

1:- علم سے کیا مراد ہے؟

2:- عقلیت کی حقیقت کیا ہے؟

3:- تجربیت اور عقلیت میں فرق بیان کریں۔

4:- وجدان اور الہام کی تصدیق انسانی ذہن نہیں کر سکتا ہے، وضاحت کریں۔

5:- کیا استناد بھی ماخذِ علم ہے، وضاحت سے بتائیں۔

6:- امام الغزالی کا فلسفۂ علم بیان کریں۔

معروضی طرز (Objective Type)

سوال 1:۔ مناسب اور ضروری اصطلاحات یا الفاظ سے خالی جگہ پر کریں۔

1:۔ ارسطو کے خیال میں علم ایک ایسا تجربہ ہے جو............ سے شروع ہوتا ہے۔

2:۔ پیغمبر سے رابطہ............ کے ذریعے ہوتا ہے۔

3:۔ عقلیت میں............ سے کام لیا جاتا ہے۔

4:۔ "میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں"۔ جدید فلسفی............ کا مشہور مقولہ ہے۔

5:۔ غلط ادراک کو............ کہتے ہیں۔

6:۔ تجربیت پسند صحیح نہیں مانتے............ خیالات کو۔

7:۔ جدید فلسفی لاک کا خیال ہے کہ "حواس ہمیں خارجی............ سے آشنا کرتے ہیں۔

8:۔ وجدان حقیقی، منفرد اور واضح ذریعہ............ ہے۔

9:۔ استنادیت میں کسی............ سے متاثر ہوا جاتا ہے۔

10:۔ یقین بھی ذیلی مآخذِ علم ہے............ میں۔

سوال 2:۔ ذیل میں سوالات کے ممکنہ دیئے گئے ہیں جوابات میں صحیح کی نشاندہی کیجئے۔

1:۔ فلسفے کی کونسی شاخ علم کی وضاحت کرتی ہے۔

1۔قدریات 2۔علمیات 3۔مابعد الطبیعیات 4۔تصورات

2:۔ یہ کس نے کہا تھا۔ "علم کو قضیوں میں بیان کیا جاتا ہے۔"

1۔جان ہاسپرز 2۔الکندی 3۔ولیم جیمز 4۔افلاطون

3:۔ بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ وہبی خیالات انسان میں ہوتے ہیں۔

1۔پیدائشی طور پر 2۔حاصل کردہ 3۔سیکھے ہوئے 4۔خودساختہ

4:۔ کسی قضیہ کے صحیح یا غلط ہونے کا انحصار کس پر ہے۔

1۔تعمیر 2۔تخریب 3۔تصدیق 4۔نقل

5:۔ مکتبہ فکر عقلیت میں جاننے کے لئے کام لیا جاتا ہے۔

1۔تجربہ سے 2۔عقل سے 3۔تحریر سے 4۔تقریر سے

6۔ مکتبہ فکر تجربیت میں جاننے کے لئے کام لیا جاتا ہے۔

1۔عقل سے 2۔تجربہ سے 3۔سوچنے سے 4۔گہرائی سے

7:۔ یہ کس کا مقولہ ہے۔''میں سوچتا ہوں، اس لئے میں ہوں''۔

1۔کانٹ 2۔ڈیکارٹ 3۔کوپرنیکس 4۔گلیلیو

سوال3: کالم''الف''اور کالم''ب''میں دیئے گئے الفاظ میں مطابقت پیدا کر کے جواب کالم''ج''میں درج کریں۔

کالم''الف''	کالم''ب''	کالم''ج''
☆ ارسطو کا خیال ہے	ابتدائی آخذ علم ہے۔	
☆ سقراط کا خیال ہے	تصدیق نہیں ہوسکتی۔	
☆ وہبی خیالات	تجربہ پر مبنی ہوتی ہے۔	
☆ حسی ادراک	حیرانی وتعجب کا تجربہ علم ہے۔	
☆ وجدان کی	علم صحیح یقین کی تصدیق کرتا ہے۔	
☆ تجربات کی بنیاد	پیدائشی ہوتے ہیں۔	
☆ جان لاک کے خیال میں	طلبا کے لئے استنادیت کا درجہ رکھتے ہیں۔	
☆ وجدان تجربہ	علم سے خودشناسی اور خداشناسی ہوتی ہے۔	
☆ اساتذہ	ذاتی ہوتا ہے۔	
☆ غزالیؒ کے خیال میں	اندرونی حواس تین ہیں۔	